تدبّرِ قرآن

٦١

الصّف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور اس کا خطاب

اس سورہ میں خطاب ان مسلمانوں سے ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع وطاعت کا عہد کر چکنے کے بعد اللہ کی راہ میں جہاد سے جی چرا رہے تھے۔ ان کو متنبہ فرمایا ہے کہ اگر عہدِ اطاعت میں داخل ہو چکنے کے بعد تمھاری روش یہی رہی تو یاد رکھو کہ تمھارا بھی وہی حال ہو گا جو یہود کا ہوا۔ انھوں نے اطاعت کا عہد کر چکنے کے بعد قدم قدم پر اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی۔ اس کج روی کی سزا ان کو یہ ملی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل اس طرح کج کر دیے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آخری نبی کی بشارت لے کر آئے اور نہایت کھلے ہوئے معجزات دکھائے تو انھوں نے سارے معجزات کو جادو قرار دیا اور ان کو جھٹلا دیا اور اب وہ اسلام کی مخالفت کے درپے ہیں حالانکہ اسلام، ان کے اور مشرکین دونوں کے علی الرغم، اس سرزمین کے تمام ادیان پر غالب آ کے رہے گا۔

اس کے بعد اس صحیح روش کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جو مسلمانوں کو اختیار کرنی چاہیے اور جو اس عہد کا لازمی تقاضا ہے جو اللہ کے رسول سے انھوں نے کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کو اس فتحِ عظیم کی بشارت دی ہے جو مستقبل قریب میں حاصل ہونے والی ہے اگر وہ اس عہد پر مضبوطی سے قائم رہے۔

آخر میں ان کے سامنے ان لوگوں کا نمونہ رکھا ہے جنھوں نے حق کی طرف سبقت اور اس کی تائید و رفاقت کی نہایت اعلیٰ مثال قائم کی اور دعوت دی ہے کہ پیروی کے قابل نمونہ ان کا ہے نہ کہ یہود کا جو ہمیشہ کے لیے اللہ کی ہدایت سے محروم ہوئے۔

ب۔ سابق سورتوں سے تعلّق

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ جس طرح پچھلی مدنی سورتوں میں منافقین کا کردار زیرِ بحث رہا ہے اسی طرح اس سورہ میں بھی انھی کے ایک گروہ کا کردار زیرِ بحث ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ پچھلی سورتوں میں جن منافقین سے بحث ہے وہ اپنے نفس کی داخلی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ خارجی بندھنوں میں گرفتار تھے لیکن اس سورہ اور اس کے بعد کی مدنی سورتوں میں ان منافقین سے بحث ہے جن کی کمزوریاں بیشتر داخلی ہیں۔ مثلاً اس سورہ میں اور اس کے بعد سورۂ جمعہ میں، جو اس کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے، حبِّ مال وجان کی بیماری

کی نشان دہی کی گئی ہے اور اس کو ان کے نفاق کا سبب بتایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے علاج کی تدابیر کی نشان دہی بھی فرمائی گئی ہے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) سورہ کی تمہید جس میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع و طاعت کا عہد کر چکنے کے باوجود اللہ کی راہ میں جہاد سے جی چرا رہے تھے۔ ان کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ روش زیادہ مبغوض ہے کہ آدمی وفاداری کا عہد کر چکنے کے بعد اس سے فرار اختیار کرے۔ اس کو محبوب وہ بندے ہیں جو اس کے ساتھ باندھے ہوئے عہد کی خاطر جب وقت آئے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صف بستہ ہو کر سرگرم پیکار ہوں۔

(۵-۹) ایمان و طاعت کا عہد کر چکنے کے بعد جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد سے جی چراتے ہیں وہ درحقیقت یہود کے نقش قدم کے پیرو ہیں۔ وہ اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے یہود ہوئے۔ انھوں نے اپنے نبی کے ساتھ یہی روش اختیار کی۔ اطاعت کا عہد بڑے جوش و خروش سے کرتے لیکن جب امتحان کا وقت آتا تو بالکل پھسڈی ثابت ہوتے۔ ان کی اس روش کا شکوہ حضرت موسیٰ نے بڑے سوز و درد کے ساتھ کیا لیکن وہ اس روش سے باز نہ آئے۔ اس کج روی کی سزا اللہ تعالیٰ نے، اپنی سنت کے مطابق، ان کو یہ دی کہ ان کے دل کج کر دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہدایت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ چنانچہ ان کی یہی کج روی حضرت عیسیٰؑ کے معاملے میں بھی ظاہر ہوئی۔ آپ کا ظہور تورات کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہوا۔ آپ نے نہایت شاندار معجزے دکھائے اور دنیا کے آخری ہادی کے ظہور کی نہایت واضح الفاظ میں بشارت دی لیکن یہود کے دل اس قدر کج ہو چکے تھے کہ انھوں نے آپ کے سارے معجزات کو جادو کا کرشمہ بتایا اور آپ کی تکذیب کر دی اور اب اپنے جھوٹ اور افترا کے بل پر اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ ساری خاکبازی لاحاصل ہے۔ اسلام اللہ کا نور ہے اس کو یہ اپنے مونہوں کی پھونک سے نہیں بجھا سکتے۔ وہ ان کے اور مشرکین دونوں کے علی الرغم تمام دینوں پر غالب آ کر رہے گا۔

(۱۰-۱۳) کمزور مسلمانوں کو صحیح راہ اختیار کرنے کی تلقین کہ اب یہ تذبذب اور منافقت کی روش چھوڑو۔ اللہ اور اس کے رسول پر سچا اور پکا ایمان لاؤ۔ دین کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرو۔ فوز و فلاح کی راہ یہی ہے بشرطیکہ سمجھو۔ اگر یہ راہ اختیار کرو گے تو آخرت کی فلاح بھی حاصل ہو گی جو اصل کامیابی ہے اور اس دنیا میں بھی اللہ کی اس نصرت اور اس عنقریب ظاہر ہونے والی فتح سے سرفراز ہو گے جس کی تمنا رکھتے ہو۔

(۱۴) آخر میں حضرت عیسیٰؑ کے حواریین کی پیروی کی دعوت ہے۔ ابتدا میں یہود کی تقلید سے روکا ہے۔ یہ آخر میں ان حق پرستوں کی پیروی پر ابھارا ہے جن کی سبقت الی الخیر سے اس فتح مندی کی راہ کھلی جو بالآخر اہل ایمان کے غلبہ پر منتہی ہوئی۔

سُوْرَةُ الصَّفِّ (٦١)

مَدَنِيَّةٌ —— اٰيَاتُهَا ١٤

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ١-٩

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿١﴾
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٢﴾ کَبُرَ مَقْتًا
عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٣﴾ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ
یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا کَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿٤﴾
وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ
اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ
لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿٥﴾ وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ
یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ
مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ
اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿٦﴾
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْکَذِبَ وَهُوَ یُدْعٰۤی
اِلَی الْاِسْلَامِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿٧﴾ یُرِیْدُوْنَ
لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ کَرِهَ

الْكٰفِرُوْنَ ۝۸ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹

ع ۹ ۹

ترجمہ آیات ۱-۹

اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور وہی غالب وحکیم ہے ۔ ۱

اے ایمان والو! تم وہ بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں! اللہ کے نزدیک یہ بات زیادہ غصہ کی ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔ اللہ تو محبوب ان لوگوں کو رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر اس طرح لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔ ۲-۴

اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میرے ہم قومو! تم مجھے کیوں دکھ پہنچاتے ہو حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمھارے پاس اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ تو جب وہ کج ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل کج کر دیے اور اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔ ۵

اور یاد کرو جب کہ کہا عیسیٰ بن مریم نے، اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، مصداق ہوں تورات کی ان پیشین گوئیوں کا جو مجھ سے پہلے سے موجود ہیں اور خوش خبری دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا، تو جب وہ آیا ان کے پاس کھلی نشانیوں کے ساتھ تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ ۶

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھے درآنحالیکہ اس کو اسلام کی طرف بلایا جا رہا ہو! اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ وہ چاہتے ہیں

کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا ان کافروں کے علی الرغم۔ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ اس کو غالب کرے تمام دینوں پر اگرچہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔ ۷-۹

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱)

آیتِ تسبیح کا آگے کے مضمون سے ربط

یہ آیت تشویق و تحریض کے محل میں بھی ہو سکتی ہے اور اظہارِ بے نیازی کے محل میں بھی۔ آگے جہاد سے جان چرانے والے منافقین کو ان کی بدعہدی و بزدلی پر ملامت کی گئی ہے۔ اس مضمون سے یہ آیت اپنے مذکورہ دونوں پہلوؤں سے ربط رکھتی ہے۔ اگر تشویق و ترغیب کے پہلو سے نگاہ ڈالیے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس خدا کی تسبیح و بندگی میں اس کائنات کی ہر چیز سرگرم ہے، جو ہر چیز پر غالب اور جس کے ہر کام میں حکمت ہے اس کی راہ میں جہاد سے اگر کوئی جان چرائے تو اس پر حیف ہے!

بے نیازی کے پہلو سے نگاہ ڈالیے تو مطلب یہ ہوگا کہ جب اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح و بندگی میں لگی ہوئی ہے اور حقیقی غالب و حکیم وہی ہے تو اس کو اس بات کی کیا پروا ہو سکتی ہے کہ کچھ بزدل اس کی راہ میں جہاد سے جان چراتے پھرتے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس سورہ میں 'سَبَّحَ' آیا ہے اور اگلی سورہ میں 'یُسَبِّحُ' ہے۔ ان دونوں اسلوبوں میں یہ فرق ہے کہ ماضی بیانِ واقعہ اور بیانِ حقیقت کے لیے آتا ہے اور مضارع تصویرِ حال اور استمرار کا فائدہ بھی دیتا ہے۔

'اَلْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ' کی دو صفتوں کا بغیر حرفِ عطف کے بیان اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں صفتیں موصوف میں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔ یعنی وہ بیک وقت ہر چیز پر غالب و قادر بھی ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت و مصلحت بھی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جو ذات ان صفات سے موصوف ہے اس سے بڑھ کر بھروسہ کے قابل اور کس کی ذات ہو سکتی ہے! بدقسمت ہیں وہ جو ایسی ذات پر بھی بھروسہ نہ کریں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۲-۳)

زبان کے غازیوں کو تنبیہ

خطاب اگرچہ باعتبارِ الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن انہی کی طرف ہے جو ایمان و اسلام اور

انفاق و جہاد کے دعوے تو بڑی بلند آہنگی سے کرتے لیکن جب آزمائش کا وقت آتا تو بالکل بزدل ثابت ہوتے۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم اس بات کا دعویٰ ہی کیوں کرتے ہو جو لوپرا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے! اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ اس زبانی جہاد سے تم کوئی سعادت کی کمائی کر رہے ہو تو یہ خیال بالکل غلط ہے تمہارا یہ رویّہ اللہ کے نزدیک تمہارے لیے موجب سعادت نہیں بلکہ مزید غضب کا باعث ہے کہ تم زبان سے تو بڑے غازی ہو لیکن عمل کے اعتبار سے بالکل صفر۔

آدمی کے قول و قرار کی ساری قدر و قیمت اس کی وفاداری و راستبازی ہی میں ہے۔ ایک شخص ایک طالبِ مدد کو پہلے ہی مرحلے میں اگر صاف جواب دے دیتا ہے کہ وہ اس کی مدد نہیں کرے گا تو گو اس کا انکار اگر وہ مدد کی اہلیت رکھتا ہے، فتوت، ہمدردی اور اسلامی اخوت کے منافی اور اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ فعل ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اللہ کے نزدیک مبغوض وہ ہوگا جس نے ایک ضرورت مند کو مدد کا اطمینان تو بڑی فراخ دلی سے دلایا لیکن جب وعدہ پورا کرنے کا وقت آیا تو اس کو دھوکا دیا۔

یہ رویّہ یوں تو ہر شکل میں مکروہ و مبغوض ہے لیکن معاملہ ایک نبی اور اس پر ایمان کے مدّعیوں کا ہو تو اس کی سنگینی اور بڑھ جائے گی۔ جو لوگ ایک نبی کی دعوت قبول نہیں کرتے وہ اللہ کے غضب کے سزاوار ہوتے ہیں اور ان کو سزاوار ہونا چاہیے لیکن ان سے بھی زیادہ اللہ کے غضب کے سزاوار وہ ہیں جو ماننے کو تو اس کی ہر بات مان لیں لیکن عمل کسی بات پر بھی نہ کریں یا صرف ان باتوں پر کریں جو ان کے نفس کی خواہشوں کے موافق ہوں اور جب کوئی اہم مرحلہ پیش آئے تو اس وقت چھپتے پھریں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا رویّہ کھلے ہوئے دشمنوں کے مقابل میں دین کے لیے زیادہ خطرناک ہے اس لیے کہ انھوں نے اپنے کو دوست ظاہر کر کے دین کی دشمنی کی اور اس کی فوج میں بھرتی ہو کر اس کے ساتھ غدّاری کے مرتکب ہوئے۔

ان کے زیادہ معتوبِ الٰہی ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جب ایک مرتبہ انھوں نے دین کو مان لیا تو گویا انھوں نے اس امر کا اعتراف کر لیا کہ یہ چیز ان کے دل کو اپیل کرنے والی اور ان کی سمجھ میں آنے والی ہے۔ اس پہلو سے ان کا معاملہ ان لوگوں سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے جو اس کے مخالف اس بنا پر ہوں کہ ابھی بات ان کی سمجھ میں سرے سے آئی ہی نہ ہو۔ کسی بات کا سمجھ میں نہ آنا بہرحال ایک عذر ہے جس کی بنا پر ایک شخص رعایت کا مستحق قرار پاتا ہے لیکن جو لوگ سمجھ چکنے کا اعتراف کر چکے ہوں اگر وہ اس کے عملی تقاضوں سے گریز اختیار کریں تو اس کا سبب صرف ان کی اخلاقی کمزوری ہی ہو سکتی ہے جو کسی کے لیے بھی کوئی عذر نہیں بن سکتی بلکہ یہ بہرشکل ایک برائی ہے جو اللہ کے غضب اور اس کی نفرت ہی کی موجب ہوگی۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (۴)

منافقین کی اصل کمزوری

یہ ان منافقین کی اس کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے جس پر یہ نکیر فرمائی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کی

خاص کمزوری یہ تھی کہ اپنی وفاداری و جاں نثاری کی دھونس جمانے کے لیے وہ جہاد کے ولولہ کا اظہار تو بہت کرتے لیکن جب جہاد کا حکم دے دیا گیا تو چھپتے پھرتے تھے۔ سورۂ نساء میں ان کی کمزوری کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ	تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا
كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ	تھا کہ ابھی اپنے ہاتھ روکو اور نماز کا اہتمام کرو
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ	اور زکوٰۃ دو (تو وہ جنگ کے لیے جلدی مچاتے تھے)
عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ	لیکن جب جنگ ان کے اوپر فرض کردی گئی تو ان
مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ	میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈر رہا
كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ	ہے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیے، بلکہ اس سے
خَشْيَةً ۚ (النسآء - ۴ : ۷۷)	بھی کچھ زیادہ۔

سورۂ توبہ میں انہی لوگوں کو ان الفاظ میں ملامت فرمائی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمھیں کیا ہوگیا
لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ	ہے کہ جب تمھیں حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں
اِلَى الْاَرْضِ (التوبۃ - ۹ : ۳۸)	جہاد کے لیے اٹھو تو تم زمین پر ڈھیے پڑتے ہو۔

ان لوگوں کی بزدلی کا حال یہ تھا کہ اگر بادے باندھے جنگ کے لیے نکلتے بھی تو صف بستہ اور سینہ سپر ہو کر لڑنے کا حوصلہ نہ کرتے بلکہ ان کی کوشش برابر یہ ہوتی کہ کسی طرح جنگ کے خطرہ سے اپنے کو محفوظ رکھیں۔ سورۂ توبہ میں ان کی اس بزدلی کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے:

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ	اگر وہ پا جائیں کوئی پناہ گاہ، یا غاریا
مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ	کوئی گھس بیٹھنے کی جگہ تو وہ رسی تڑا کر اس کی
يَجْمَحُوْنَ ۝ (التوبۃ - ۹ : ۵۷)	طرف بھاگیں گے۔

ان لوگوں کی انہی کمزوریوں کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ تم نے محض زبانی جمع خرچ سے اللہ کو خوش کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے یہ اس کو خوش کرنے کے بجائے اس کے قہر و غضب میں مزید اضافے کا موجب ہوگا۔ اللہ ان لوگوں کو کبھی پسند کرنے والا نہیں ہے جو ڈینگیں تو بہت ماریں لیکن قربانی کا کوئی حوصلہ اپنے اندر نہ رکھتے ہوں۔ وہ محبوب انہی لوگوں کو رکھتا ہے جو میدانِ جنگ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔

'بُنْيَانٌ' عمارت کو کہتے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد دیوار ہے۔ دیوار کی ایک اینٹ بھی اگر اپنی جگہ سے کھسک جائے تو پھر پوری دیوار کو اکھاڑ پھینکنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے

سورۂ انفال میں تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص منظم فوج کشی کی صورت میں صف سے اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگتا ہے تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹتا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے : فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (الانفال - ۸ : ۱۶) (تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے)۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۖ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۵)

منافقین کی روش کی مثال

منافقین کی اس روش کے انجام کو مثال سے واضح فرمایا ہے کہ یہی روش یہود کی رہی ہے، وہ جہاد کے لیے جوش و جذبہ کا اظہار تو بہت کرتے لیکن جب امتحان کا وقت آتا تو ڈگ ڈال دیتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب انھیں فلسطینیوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا تو وہ یہ جواب دے کر بیٹھ رہے کہ یہ بڑے زور آور لوگ ہیں، ہم ان کی تلواروں کا لقمہ بننے کے لیے تیار نہیں ہیں، آپ اپنے رب کے ساتھ جا کر ان سے لڑو، ہم تو جب تک وہ اس شہر کو خالی نہیں کریں گے اس میں داخل ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

ان کی یہی روش اس جنگ کے معاملے میں بھی رہی جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں ہوا ہے کہ جہاد کے لیے قائد کا انتخاب تو انھوں نے حضرت سموئیلؑ سے بڑے جوش و خروش سے کرایا لیکن جب قائد کا انتخاب ہو گیا تو اس کی قیادت میں جنگ سے انھوں نے انکار کر دیا۔

تورات کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ایک موقع بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب انھوں نے پوری خوش دلی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کی ہو۔ ان کی اس روش پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بار بار نہایت دل سوزی کے ساتھ اپنے غم و غصہ کا اظہار بھی فرمایا ہے اور نہایت سخت الفاظ میں ان کو ملامت بھی کی ہے لیکن آخر وقت تک ان کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ ان کے دل کی سختی بڑھتی ہی گئی۔

'يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ'۔ یہ حضرت موسیٰؑ کے انہی شکووں کا حوالہ ہے جو اپنی قوم کی بدعہدیوں اور نافرمانیوں پر انھوں نے بار بار کیے ہیں اور جن سے تورات بھری پڑی ہے۔ یہود کو حضرت موسیٰؑ کی نبوت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ انھیں اچھی طرح علم تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن اس کے باوجود محض اپنی پست ہمتی، دنیا طلبی اور دناءت کے سبب سے، یہ جانتے ہوئے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، ان کی برابر نافرمانی کرتے رہے۔

'فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ'۔ یہ وہ سزا ہے جو اللہ تعالیٰ نے، اپنی سنت کے مطابق، ان کو دی کہ بار بار کی تنبیہ و تذکیر کے بعد بھی انھوں نے اپنے دل کے رخ کو سیدھا نہیں کیا تو اللہ نے

ان کے دل کو اسی رخ پر کج کر دیا جس کو انھوں نے اپنے لیے پسند کیا۔ انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ آدمی اسے جس رُخ پر لگائے اسی رُخ پر لگ جاتی ہے۔ اگر اس کو آپ عقل و فطرت کے خلاف کسی غلط رخ پر موڑیں گے تو وہ شروع شروع میں اس پر مڑنے سے اِبا کرے گی لیکن آپ اسے موڑنے پر بضد رہیں گے تو بالآخر اسی سانچہ پر وہ ڈھل جائے گی۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

ہدایت و ضلالت کے معاملے میں انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اس کی طبیعت کے اسی اصول کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کو ہدایت پر مجبور کرتا نہ ضلالت پر۔ اس نے انسان کے اندر نیکی اور بدی کا شعور دے کر اسے آزادی بخشی ہے کہ چاہے وہ نیکی کی راہ اختیار کرے یا بدی کی۔ اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے تو وہ اس کو اس کی توفیق ارزانی فرماتا ہے اور اگر وہ بدی کی راہ پر جانا چاہتا ہے تو وہ اس کو اس کی ڈھیل بھی دے دیتا ہے، اگر چاہتا ہے۔

'وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ' یعنی اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ نہیں ہے کہ کوئی پسند تو کرے ضلالت لیکن وہ اس کے اندر زبردستی ہدایت ٹھونسے۔ ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اس کی قدر کرتا اور اس کا طالب بنتا ہے۔

یہ ان منافقین کو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ تم بھی یہود کی اسی روش کی پیروی کرو گے تو تمھارے دل بھی اسی طرح کج کر دیے جائیں گے جس طرح ان کے دل کج کر دیے گئے۔ پھر تم ہمیشہ غلط رخ ہی پر چلو گے، صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ گے۔

وَاِذۡ قَالَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوۡرٰٮةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ يَّاۡتِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِى اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ (۶)

دل کی کجی کے اثرات جو بعد میں ظاہر ہوئے۔

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ ان کے دل کی اسی کجی کا اثر ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے بھی محروم رہے اور جس آخری رسول کی بشارت آنجنابؑ نے دی اس کی تکذیب کے لیے بھی آج رات دن خاکبازی میں مصروف ہیں حالانکہ ان کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم اللہ کا یہ نور کامل ہو کر رہے گا، نہ یہ اس کا کچھ بگاڑ سکیں گے نہ مشرکینِ قریش۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں۔ ان کے ذکر سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل نے جو سلوک کیا اور اس کی پاداش میں ان پر جو لعنت ہوئی، اس کا اثر بد ان پر آخر تک مسلط رہا یہاں تک کہ اسی کے نتیجہ میں انھوں نے حضرت مسیحؑ کی بھی تکذیب کی اور اب اسلام کی جو مخالفت کر رہے ہیں یہ بھی اسی کا اثر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بیماری ایسی جان لیوا ہے کہ ایک مرتبہ لگ گئی تو پھر اس سے جان چھڑانا ناممکن ہے۔ سلامتی اسی میں ہے کہ اس کی چھوت نہ

لگنے دی جائے۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ' - یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی رسالت کی دلیل کے طور پر فرمائی کہ میرے ظہور سے ان پیشین گوئیوں کی تصدیق ہوئی ہے جو میرے باب میں تورات کے صحیفوں میں موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سب سے زیادہ واضح بشارت تو ان کے پیش رو حضرت یحییٰؑ نے دی۔ انھوں نے اپنا خاص مشن ہی یہ بتایا کہ وہ اپنے بعد آنے والے کی خوش خبری دینے آئے ہیں۔ اپنی اسی بشارت کے ضمن میں انھوں نے ان پیشین گوئیوں کا بھی حوالہ دیا جو حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں پہلے سے موجود تھیں اور جن کی بنا پر لوگوں کو ایک نبی کی بعثت کا انتظار تھا۔ یہ ساری چیزیں اپنے محل میں بیان ہو چکی ہیں۔ یہاں اعادے کی گنجائش نہیں ہے۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا' کا صحیح مفہوم

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ' کے لغوی مفہوم پر اس کے محل میں مفصل بحث ہو چکی ہے۔ جو لوگ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ 'میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں' انھوں نے نہ تو اس کلام کا موقع و محل سمجھا ہے نہ 'مُصَدِّقًا' کا صحیح لغوی مفہوم وہ متعین کر سکے ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے یہ بات اپنے کو مومن بالتوراۃ ظاہر کرنے کے لیے نہیں فرمائی ہے بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اپنی نبوت و رسالت کی دلیل کے طور پر فرمائی ہے اور قرآن میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اسی سیاق میں آیا ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ بات بالکل لاحاصل ہے کہ میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ اگر انھوں نے تورات کی تصدیق فرمائی تو اس سے جو بات ثابت ہوئی وہ صرف یہ ہے کہ وہ تورات پر ایمان رکھتے تھے لیکن اس سے ان کی نبوت و رسالت کس طرح ثابت ہو جائے گی؟ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ تورات کے ہر حصہ کی تصدیق نہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمائی ہے نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اس کی تحریفات سے پردہ اٹھایا ہے اور قرآن نے بھی۔ بلکہ قرآن نے تو اس کے اچھی طرح بخیے ادھیڑے ہیں۔

آنحضرتؐ کے باب میں حضرت مسیحؑ کی پیشین گوئی کی اہمیت

'وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ' - یعنی ساتھ ہی حضرت مسیحؑ نے اپنا مشن بھی بتایا کہ میں ایک رسول کی خوش خبری دینے آیا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہو گا۔ جہاں تک اس رسول کی پیشین گوئی کا تعلق ہے وہ تو سیدنا ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آ رہی ہے جس کا ذکر اگلی سورہ میں بھی آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد حضرت موسیٰؑ نے بھی اس رسول کی خوش خبری دی۔ بعض دوسرے انبیاء سے بھی تورات کے مختلف صحیفوں میں پیشین گوئیاں موجود ہیں اور اہل کتاب ان کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مانیں یا نہ مانیں لیکن ایک غیر جانبدار ذہن یہ ماننے پر مجبور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر وہ منطبق نہیں ہو سکتیں۔ الغرض جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا تعلق ہے اس میں حضرت مسیح علیہ السلام منفرد نہیں ہیں لیکن

آنجناب کی بشارت تین پہلوؤں سے دوسری سابق بشارتوں سے بالکل مختلف ہے۔

ایک یہ کہ آپ نے اس بشارت کو اپنا ایک ضمنی کام نہیں بلکہ اپنی بعثت کا خاص مقصد اور مشن بتایا ہے۔

دوسرا یہ کہ آپ نے اس کے ظہور کا زمانہ بھی بالکل قطعی طور پر متعین کر دیا ہے۔

تیسرا یہ کہ آپ نے یہ بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کی تصریح کے ساتھ دی ہے۔

یہ تینوں پہلو خاصے اہم ہیں، اس وجہ سے ہم بالاختصار ان پر یہاں گفتگو کریں گے۔

انجیل کا انجیل سے موسوم ہونے کی حکمت

پہلی بات یعنی حضرت مسیحؑ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت پر مامور ہونا ان کے الفاظ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗ سے بھی واضح ہے لیکن اس سے بڑی دلیل خود اس صحیفہ کا نام ہے جو ان پر نازل ہوا۔ لفظ 'انجیل' بلا اختلاف یونانی ہے جس کے معنی مسلّم طور پر 'بشارت' کے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تمام آسمانی صحیفوں میں یہی صحیفہ خاص طور پر اس لفظ سے کیوں موسوم ہوا؟ عیسائی ممکن ہے نجات سے متعلق اپنے من گھڑت عقیدے کی بنا پر اس کی توجیہ یہ کریں کہ یہ بنی آدم کے لیے نجات کی بشارت ہے، لیکن یہ توجیہ بالکل طفلانہ ہے۔ نجات سے متعلق جو عقیدہ پال نے گھڑا ہے اس کی کوئی الٹی سیدھی دلیل پال کے لاطینی علم کلام میں ہو تو ہو لیکن ان انجیلوں میں اس کی کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا مشن جس طرح بشارت رہا ہے اسی طرح بلکہ کسی قدر زائد انذار بھی رہا ہے اور یہ دونوں فرض جس طرح ہر نبی نے انجام دیے اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی انجام دیے۔ انھوں نے ایمان لانے والوں کو فوز و فلاح کی بشارت بھی دی اور کفر کرنے والوں کو دوزخ سے ڈرایا بھی۔ پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان کے صحیفہ کا نام مخصوص طور پر بشارت (انجیل) ہی ہوتا۔ البتہ اس نام سے موسوم ہونے کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا امتیازی وصف اور خاص مشن تھا ہی یہ کہ وہ اپنے بعد آنے والے آخری رسول کی بشارت دیں۔ اس مشن پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کر کے بھیجے گئے تھے۔

اس وجہ سے ان کے صحیفہ کا نام ہی بشارت (انجیل) ہوا کہ نام ہی سے آپ کے مشن کا اظہار ہو اور یہ نام قیامت کے دن عیسائیوں پر حجت بنے کہ جس کی بشارت دینے پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوئے اس پر ایمان لانے سے خود محروم رہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام کی کنواریوں والی تمثیل ان پر صادق آئی کہ رات بھر تو وہ شمعیں جلائے دولہا کا انتظار کرتی رہیں لیکن جب دولہا کے آنے کا وقت ہوا تو ان کی کپیوں کا تیل ختم ہو گیا اور وہ سو رہیں۔

انجیلوں کا تدبر سے مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان کا خاص مضمون آسمانی بادشاہت کی بشارت ہے۔ مختلف اسلوبوں، پیرایوں اور گوناگوں تمثیلوں سے یہی مضمون ان میں بار بار آتا ہے۔ اس آسمانی بادشاہی کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں، اس کے تدریجی نشوونما کا جو تصور دیا گیا ہے، اس میں داخل

رہنے والوں اور اس سے محروم رہنے والوں کے جو اوصاف مذکور ہوئے ہیں اگر ان پر اچھی طرح غور کیجیے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ یہ درحقیقت اس نبوّت کی بشارت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں ظاہر ہوئی اور اس نظام صالح کی خوش خبری ہے جس کی برکتیں صحابہؓ کے ہاتھوں زمین پر پھیلیں۔

یہاں اس مسئلہ کی وضاحت کا موقع نہیں ہے ورنہ میں مثالیں دے کر اپنا نقطۂ نظر اچھی طرح واضح کر دیتا۔ تاہم مجھے امید ہے کہ جو لوگ انجیلوں پر اس پہلو سے غور کریں گے وہ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ ان کا اصل مضمون اس آسمانی بادشاہی کی بشارت ہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے قائم ہوئی۔

یہ پیشین گوئی تعیین زمانہ کے ساتھ ہے

اس پیشین گوئی میں زمانے کے تعیین کی بات بھی اس کی اہمیت کو بہت بڑھا دیتی ہے۔ اس سے پہلے جتنی پیشین گوئیاں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے انبیاء علیہم السلام کے باب میں وارد ہوئیں ان میں سے کسی میں بھی اس تصریح کے ساتھ زمانے کا تعیین نہیں ہے بلکہ سب ایک غیر معیّن مستقبل سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ لیکن اس پیشین گوئی میں یہ تصریح ہے کہ وہ رسول آپ کے بعد آئے گا اور آپ اس کی بشارت دینے اور اس آنے والے کی راہ صاف کرنے آئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ سیدنا مسیحؑ کے بعد وہ کون شخصیت اس پوری دنیا میں ظاہر ہوئی ہے جس پر وہ صفات یا وہ تمثیلات منطبق ہو سکیں جو آنجنابؑ نے اس کے باب میں یا اس کے ہاتھوں قائم ہونے والے نظام سے متعلق فرمائی ہیں؟ ضد اور ہٹ دھرمی کی بات اور ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے جواب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ اگر عیسائی یہ نام نہیں لینا چاہتے تو پھر انھیں انجیلوں سے بھی دست بردار ہو جانا چاہیے۔ آخر وہ کب تک ایک ایسی بشارت دیتے رہیں گے جس کا کوئی مصداق دو ہزار سال میں ظاہر نہیں ہوا۔

نام کی تصریح کے ساتھ بشارت

مسئلہ کا تیسرا پہلو بھی نہایت اہم بلکہ سب سے زیادہ اہم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت نام کی تصریح کے ساتھ دی ہے۔ نام کی صراحت کے ساتھ اس پیشین گوئی کا ظہور میں آنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس میں کسی قسم کا خفا نہ رہے بلکہ ہر چیز اس طرح کھل کر سامنے آ جائے کہ جو لوگ اس کا انکار کریں ان کی ہٹ دھرمی بالکل بے نقاب اور ان پر اللہ کی حجت اچھی طرح قائم ہو جائے۔

ناموں کا تحریف میں اہل کتاب کی جسارت

لیکن ناموں کے اوپر تحریف کرنے والوں نے جو قیامت ڈھائی ہے وہ سب سے زیادہ دردناک ہے۔ انھوں نے یا تو ان ناموں کا حلیہ اس طرح بگاڑا کہ ان کی اصل صورت معلوم کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ جائے یا ان کا ترجمہ اور پھر ترجمہ در ترجمہ کر کے ان کو حقیقت سے اتنا دور کر دیا کہ ان کی تحقیق کی کاوش جوئے شیر لانے کے مترادف بن گئی۔

اس کی مثال کے لیے "مروہ" اور "بکہ" کو پیش کرتے ہیں۔ یہ دونوں نام تورات میں آئے ہیں۔ مروہ وہ قربان گاہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی پیش کی اور بکہ (مکہ) وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا اور جن کی ذریت سے ایک رسول کی بعثت کی دعا فرمائی۔ چونکہ یہود یہ بات کسی قیمت پر گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کا کوئی تعلق مکہ سے ثابت ہو سکے یا یہ کہ قربان ہونے والا فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قرار دیا جا سکے اس وجہ سے انھوں نے نہایت سفاکی کے ساتھ ہر اس نشان کو تورات سے کھرچ کھرچ کر مٹایا جس کو انھوں نے اپنی خواہش کے خلاف پایا۔ چنانچہ "مروہ" کو ان کے علماء اور قاریوں نے زبان کے توڑ مروڑ سے مُورہ، مُوریا، مُریا اور نہ جانے کیا کیا بنایا۔ اسی طرح بکہ کو 'بکار' بنایا اور پھر اس کو 'وادیِ بکار' کا نام دے کر مترجموں نے اس کا ترجمہ 'وادیِ گریہ' کر دیا حالانکہ بکہ اور مکہ دونوں ایک ہی چیز ہے۔ اس کی تحقیق اس کتاب میں اس کے محل میں گزر چکی ہے۔[1]

ان دو مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تورات اور انجیل میں ان ناموں پر کیا گزری ہے جن کو یہودیوں یا عیسائیوں نے اپنے مقصد کے خلاف پایا ہے۔ خاص طور پر 'احمدؐ' یا 'محمدؐ' تو ایسے نام ہیں کہ ان کا کوئی حرف بھی وہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انجیلوں سے یہ بات تو صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے نام کی تصریح کے ساتھ حضورؐ کی بعثت کی بشارت دی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عیسائی علماء نے اس نام پر پردہ ڈالنے میں وہ کمالِ فن دکھایا ہے کہ یہود کے سوا کوئی اور اس کمال میں ان کا حریف نہیں ہو سکتا۔

پہلے ہم انجیل یوحنا سے وہ حوالے نقل کرتے ہیں جن میں حضورؐ کی بشارت دی گئی ہے، اس کے بعد ان کے خاص خاص پہلوؤں کی طرف توجہ دلائیں گے۔ سیدنا مسیحؑ فرماتے ہیں:

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔ یعنی سچائی کا روح۔" (یوحنا۔ باب ۱۴: ۱۶-۱۷)

"لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمھیں یاد دلائے گا۔" (یوحنا۔ باب ۱۴: ۲۶)

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" (یوحنا۔ باب ۱۴: ۳۰)

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن۔ جلد اول، صفحات ۳۷۴-۳۸۷

روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا۔" (یوحنا۔ باب ۱۵: ۲۶)

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔" (یوحنا۔ باب ۱۶: ۷)

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔" (یوحنا۔ باب ۱۶: ۱۲-۱۳)

یہ حوالے ہم نے انجیل یوحنا سے لیے ہیں جو عیسائیوں کے تمام فرقوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ انجیل برناباس میں حضورؐ کی بشارت آپ کے نام نامی "محمدؐ" کی تصریح کے ساتھ بار بار وارد ہوئی ہے لیکن اس کے حوالے ہم اس لیے نہیں دے رہے ہیں کہ موجودہ عیسائی، جو پال کے پیرو ہیں، اس کو مستند نہیں مانتے۔ مذکورہ بالا حوالوں پر غور کیجیے تو چند باتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ایسی واضح صفات کے ساتھ دی ہے کہ وہ حضورؐ کے سوا کسی دوسرے پر منطبق نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً

"وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔"

"وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا۔"

"دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔"

غور کیجیے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہے جس کو ان صفات کا مصداق قرار دیا جا سکے؟

دوسری یہ کہ ان پیشین گوئیوں کے پیش و عقب میں اگرچہ ایسے بے جوڑ فقرے اور الفاظ گھسانے کی کوشش کی گئی ہے جن سے ان کے مطلب کو خبط کیا جا سکے لیکن اس کوشش میں تحریف کرنے والوں کو کامیابی نہیں ہوئی ہے بلکہ ان فقروں کا بے ربط ہونا بالکل نمایاں ہے۔

تیسری یہ کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں کوئی معیّن لفظ فرمایا جس کو بعد کے مترجموں اور شارحوں نے اپنی تحریف کا خاص طور پر ہدف بنایا اور اپنا پورا زور لگایا ہے کہ اس کو جس حد تک اس کے صحیح مفہوم سے دور کر سکیں کر دیں۔ کسی نے اس کا ترجمہ "مددگار" کیا ہے، کسی نے "وکیل"، کسی نے "شفیع"، کسی نے "سچائی کی روح"۔ رہا یہ کہ وہ لفظ کیا ہے تو یوحنا میں جو یونانی لفظ استعمال ہوا ہے وہ (PARACLETUS) بتایا جاتا ہے، جس کے معنی بیان کرنے میں وہ موشگافیاں کی گئی ہیں جو اوپر بیان ہوئیں۔ یہ یونانی لفظ ظاہر ہے کہ کسی سریانی لفظ کا ترجمہ ہو گا اس لیے کہ انجیل کی اصل زبان سریانی تھی تو اب اس کی تحقیق کون کرے کہ وہ کیا تھا۔ جب ایک لفظ کو گم

کرنے کی جدوجہد میں صدیوں سے ایک پوری قوم کی قوم لگی ہو تو اس کا سراغ لگانا کس کے امکان میں ہے! یہ تو قرآن کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس کا کچھ سراغ دیا۔ بعض مسلمان مورخین کی تحقیق یہ ہے کہ اصل سریانی لفظ 'منحمنا' ہے جس کے معنی سریانی میں وہی ہیں جو 'محمد' اور 'احمد' کے ہیں۔

یہود کی شقاوت

'فَلَمَّا جَآءَهُم بِالْبَيِّنَٰتِ قَالُوا۟ هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ'۔ 'جَآءَ' کے فاعل حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ یعنی وہ سابق پیشین گوئیوں کے مصداق اور اپنے بعد آنے والے رسولِ خاتمؐ کے مبشر بن کر، نہایت کھلے ہوئے معجزات کے ساتھ جب آئے تو یہود کے دل اس طرح کج ہو چکے تھے کہ انھوں نے آپ کے تمام معجزات کو جادو قرار دیا اور آپ کی تکذیب کر دی۔ انجیل میں تصریح ہے کہ یہود نے آپ کے معجزات کو جادو کا کرشمہ بھی قرار دیا اور یہ بھی کہا کہ یہ جو کچھ دکھاتے ہیں اس میں روح القدس کی تائید کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ان کو ایک بھوت، بعلزبول کی مدد حاصل ہے۔ بعض لوگوں نے 'جَآءَ' کا فاعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے لیکن یہ سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہے۔

ایک دقیق پہلو

یہاں اس فرق کو بھی ملحوظ رکھیے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے اندازِ خطاب میں نمایاں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو بنی اسرائیل کو 'يَٰقَوْمِ' سے مخاطب کیا لیکن حضرت مسیحؑ نے ان کو 'يَٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ' سے مخاطب کیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ قومی تعلق نہ آپ کا بنی اسرائیل سے تھا نہ کسی اور قوم سے، بلکہ آپ عیسیٰ بن مریم تھے۔ قرآن نے خطاب کے ان باریک پہلوؤں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ ٱفْتَرَىٰ عَلَى ٱللَّهِ ٱلْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَىٰٓ إِلَى ٱلْإِسْلَٰمِ ۚ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ (۷)

یہ یہود کی بدقسمتی پر اظہارِ افسوس ہے کہ اپنی جس کجی کے سبب سے انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تکذیب کی اسی کجی نے اب ان کو اسلام کی مخالفت پر ابھارا ہے۔ فرمایا کہ ان سے بڑھ کر اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا کون ہو سکتا ہے جن کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو اور وہ اسلام کی مخالفت کے بہانے پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ پر طرح طرح کے جھوٹ گھڑ رہے ہوں۔

یہود کے من گھڑت دعوے

'ٱفْتَرَىٰ عَلَى ٱللَّهِ ٱلْكَذِبَ' سے ان باتوں کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اپنی بزرگی و برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی شان میں گھڑ رکھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ہم ایک برگزیدہ اور خدا کی منظورِ نظر امت ہیں، ہم کسی ایسے نبی کی ہدایت کے محتاج کس طرح ہو سکتے ہیں جو امیوں کے اندر پیدا ہوا ہو؟ نبوت و رسالت کے لیے تو ہمیشہ سے اسرائیل کا گھرانا مخصوص رہا ہے، اس سے باہر کوئی نبی کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ اسی ضمن میں یہ بات بھی انھوں نے گھڑ رکھی تھی کہ ہمیں تو یہ ہدایت ہے کہ ہم کسی ایسے شخص کے دعوائے نبوت کی تصدیق ہی نہ کریں جس کی پیش کی ہوئی قربانی کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ نہ اترے۔ قرآن

نے سورۂ بقرہ میں ان تمام من گھڑت باتوں کی تردید فرمائی کہ یہ سب افتراء ہے، اللہ نے کہیں بھی اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی ہے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں فرمایا کہ کتنے محروم القسمت ہیں وہ لوگ جن کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے اور وہ خود اپنی آنکھوں میں اپنی ہی گھڑی ہوئی خرافات کی ڈھول جھونک رہے ہیں۔

'وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ' یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف پھر اشارہ فرما دیا جو آیت ۵ میں بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا جو خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو ان پر یہ احسان فرمایا کہ آنے والے نبی کے باب میں ان کو پہلے سے رہنمائی دی کہ یہ اسے خود بھی پہچانیں اور دوسروں کو بھی پہچنوائیں لیکن جب انھوں نے اس احسان کی یہ قدر کی کہ اللہ کے بتائے ہوئے نشانات خود مٹا رہے ہیں تو ایسے شامت زدوں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۸)

یہود کی سعیِ لاحاصل کی تمثیل

یہ اس سعیِ لاحاصل کی تمثیل ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت کو اپنی من گھڑت باتوں اور اپنی ایجاد کردہ بدعات سے دبانے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے کہ سورج یا چاند کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھانے کی کوشش کی جائے۔ فرمایا کہ ان کی یہ کوشش لاحاصل رہے گی۔ اللہ اپنے اس نور کو کامل کر کے رہے گا۔ یہ بہت جلد ہلال سے بدر بنے گا، اگرچہ یہ چیز کفار پر کتنی گراں گزرے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹)

غلبۂ اسلام کا واضح اعلان

یہ 'وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ' کی وضاحت ہے کہ اسی خدا نے جس نے اپنے نور کو کامل کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے، اپنی ہدایت اور اپنے دینِ حق کے ساتھ اپنے رسول کو بھیجا ہے کہ اس دین کو اس سرزمین کے تمام ادیان پر غالب کرے، اور یہ بات لازماً ہو کے رہے گی اگرچہ مشرکین کو یہ کتنی ہی ناگوار گزرے، اور وہ اس کے خلاف کتنا ہی زور لگائیں۔

اوپر والی آیت میں 'وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ' فرمایا ہے جو فی الجملہ عام ہے۔ جس میں وہ سب شامل ہیں جو اس دینِ حق اور اس رسولِ برحق کے انکار کرنے والے تھے۔ اس آیت میں 'وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ' کے الفاظ ہیں جو خاص مشرکینِ قریش کے لیے ہیں۔ ان دونوں لفظوں نے مل کر ان تمام مخالف طاقتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جو اس وقت عرب میں اسلام کی مخالفت کر رہی تھیں۔ گویا ان سب کو چیلنج کیا ہے کہ تمھیں جتنا زور لگانا ہے لگا لو لیکن تم اللہ کے دین کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے۔ اللہ کا قطعی فیصلہ یہی ہے کہ اس رسول کے ذریعہ سے اس کا دینِ حق اس سرزمین کے تمام ادیان پر غالب آکے رہے گا۔ چنانچہ یہ

بات پوری ہو کر رہی۔ بہت جلد وہ وقت آگیا کہ پورے عرب کے متعلق یہ اعلان ہو گیا کہ اس سرزمین میں دو دین جمع نہیں ہوں گے بلکہ صرف اللہ کے دین ہی کی حکمرانی ہو گی یہی مضمون سورۂ توبہ میں ان الفاظ میں گزر چکا ہے:

يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝ (التوبۃ-۹: ۳۲-۳۳)	وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھا دیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا، ان کافروں کے علی الرغم۔ وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو سارے دین پر غالب کرے، اگرچہ یہ بات مشرکوں کو کتنی ہی بری لگے۔

۲- آگے آیات ۱۰-۱۴ کا مضمون

اوپر کے پیرے میں یہ بتایا ہے کہ اہل ایمان کے لیے یہ روش تو بالکل ہی غلط ہے کہ وہ رسول سے سمع وطاعت کا عہد کریں اور جب اس عہد کی ذمہ داریاں پوری کرنے کا وقت آئے تو جان و مال کی محبت میں پھنس کر اس سے فرار کی کوشش کریں۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان کے لیے صحیح روش کیا ہے جس کو اختیار کر کے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۰-۱۴

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۱﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۲﴾ وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۳﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا

أَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ أَنْصَارِيْٓ إِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ بَنِيْٓ إِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَأَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝ (۱۴) ع ۲

ترجمۂ آیات ۱۰-۱۴

اے ایمان والو! کیا میں تمھیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمھیں ایک دردناک عذاب سے نجات بخشے! تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو، اللہ تمھارے گناہ بخشے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں داخل کرے گا جو ابد کے باغوں میں ہوں گے۔ دراصل بڑی کامیابی یہ ہے! اور ایک اور چیز بھی ہے جس کی تم تمنا رکھتے ہو۔ یعنی اللہ کی نصرت اور عنقریب ظاہر ہونے والی فتح! اور ایمان والوں کو بشارت دے دو! ۱۰-۱۳

اے ایمان والو! تم اللہ کے انصار بنو، جیسا کہ عیسٰی ابن مریم نے دعوت دی حواریوں کو، کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے انصار بنتے ہیں تو بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا۔ تو ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابل میں مدد کی تو وہ غالب رہے۔ ۱۴

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ (۱۰)

یعنی ایمان لانے اور رسول سے سمع و طاعت کا عہد کر چکنے کے بعد اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ تمھارے

لیے صحیح روش کیا ہے تو آؤ میں تمھیں وہ سودا بتاتا ہوں جو تمھیں ایک دردناک عذاب سے نجات دینے والا بنے گا۔ یہاں جس چیز کو تجارۃ (سودا) سے تعبیر فرمایا ہے اس کی وضاحت آگے آرہی ہے کہ تم اپنی جان اور اپنا مال اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار رہو اور اس کے بدلے میں اللہ کی مغفرت اور اس کی جنت کے حق دار بنو۔ یہ سب سے بڑی کامیابی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے تمھیں بازی کھیلنی چاہیے۔

اہل ایمان کے لیے کامیاب تجارت

اس آیت میں تو اس کا صلہ یہی بتایا ہے کہ دوزخ کے دردناک عذاب سے نجات پاؤ گے لیکن آگے کی آیات میں وضاحت آرہی ہے کہ اس کے صلہ میں تمھیں آخرت کی بھی تمام کامرانیاں حاصل ہوں گی اور اس دنیا میں بھی تمھیں وہ فتح عظیم حاصل ہوگی جس کے تم متمنی ہو۔ یہاں صرف عذاب سے نجات کا ذکر اس وجہ سے فرمایا کہ مومن کا اصل مطلوب یہی ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے۔ اگر یہ چیز حاصل ہوگئی تو گویا سب کچھ حاصل ہوگیا۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۙ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۱-۱۲)

عربیت کے ایک اسلوب کی وضاحت

عربیت کے اس اسلوب کی طرف جگہ جگہ ہم اشارہ کرتے آرہے ہیں کہ جب امر یا نہی کے اندر موعظت اور ناصحانہ تلقین کا مضمون پیدا کرنا ہو تو ان کو خبر کے اسلوب میں کر دیتے ہیں چنانچہ اس آیت میں 'تُؤْمِنُوْنَ' اور 'تُجَاهِدُوْنَ' بظاہر تو خبر کے اسلوب میں ہیں لیکن یہ معنی میں امر کے ہیں۔ اس اسلوب کا فائدہ یہاں یہ ہوا کہ گویا ان کو نہایت شفقت کے ساتھ یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ ہم تمھیں نہایت نفع بخش کاروبار بتا رہے ہیں کہ تم اپنا مال اور اپنی جان اللہ کے حوالہ کرو اور اس کے بدلے میں ابدی بادشاہی حاصل کرو۔

'ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'۔ یعنی بظاہر تو یہ سودا تمھیں خسارے کا سودا معلوم ہوگا اس لیے کہ تمھیں نسیہ کی خاطر اپنے نقد کی قربانی کرنی پڑے گی لیکن اصل حقیقت تک تمھاری نظر پہنچ جائے تو تم یہ دیکھو گے کہ اپنے چند خزف ریزوں اور عمر فانی کے چند مستعار لمحات کے بدلے میں تم نے دولتِ کونین حاصل کی ہے جس کے لیے کبھی زوال نہیں ہے۔

'ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ'۔ اس دولتِ کونین کی طرف بالاجمال اشارہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر سوچو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ یہ سب سے بڑی کامیابی ہے جو تمھیں حاصل ہوئی۔ اپنی حقیر متاع سے اس سے بڑی کوئی اور کامیابی تم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس نفع بخش کاروبار کا ذکر دوسرے مقام میں یوں آیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط (التوبۃ ۹: ۱۱۱)

(اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض میں خرید لیے ہیں)۔

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۳)

اس دنیا میں کامیابی اور غلبہ کی بشارت

یہ ایک ایسی کامیابی کی طرف بھی اشارہ فرما دیا جوان کو عنقریب اس دنیا میں ظاہر ہونے والی ہے۔ فرمایا کہ ایک اور کامرانی بھی تم کو حاصل ہو گی جو عنقریب ظاہر ہونے والی ہے۔

یہ اشارہ ہمارے نزدیک فتح مکہ کی طرف ہے۔ ہجرت کے بعد سب سے بڑی تمنا جو ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں تھی وہ فتح مکہ ہی کی تھی۔ اسی پر اسلام کے اصل دشمنوں کی شکست کا انحصار بھی تھا اور یہی غلبۂ حق کی سب سے بڑی شہادت بھی تھی۔ اس وجہ سے ہر مسلمان اپنی تمام جدّ وجہد کے اصل نصب العین کی حیثیت سے اس کا آرزو مند تھا۔

فتح مکہ کی بشارت

'فَتْحٌ' کی صفت یہاں 'قَرِیْبٌ' آئی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب فتح مکہ کے ظہور میں زیادہ دیر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بعض لوگوں نے سورہ کا زمانۂ نزول غزوۂ احد کے لگ بھگ بتایا ہے لیکن یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ سورہ کے زمانۂ نزول کا اندازہ کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ماخذ یہی آیت ہو سکتی ہے اور اس سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ فتحِ مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی ہے۔

'وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ'۔ جب زبان پر فتح مکہ کا ذکر آ گیا تو رب عزّ وجلّ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرما دی کہ اب تم مسلمانوں کو بشارت سنا دو کہ یہ مبارک ساعت دور نہیں ہے۔ اس کا ظہور جلد ہی ہونے والا ہے۔ لوگ حوصلہ بلند رکھیں اور اس کا انتظار کریں۔ فتح مکہ کی بشارت مختلف اسلوبوں سے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر وارد ہوئی ہے۔ اگرچہ قطعیت کے ساتھ کہنا تو مشکل ہے لیکن یہ بشارت اس طرح وارد ہوئی ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ شاید سب سے پہلی بشارت یہی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَکَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ (۱۴)

حواریوں کا قابلِ تقلید نمونہ

اوپر آیت ۵ میں مسلمانوں کو یہود کی روش کی تقلید سے روکا ہے کہ اگر ان کے نقشِ قدم پر چلو گے تو اسی زیغِ نظر میں مبتلا ہو کر رہ جاؤ گے جس میں وہ مبتلا ہوئے۔ اب یہ بتایا کہ تمہارے لیے قابلِ تقلید نمونہ حواریین کا ہے جنھوں نے یہود کی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی تکذیب نہیں کی بلکہ جب حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو اللہ کے لیے اٹھنے کی دعوت دی تو وہ پورے جوشِ دل کے ساتھ اس راہ میں نصرت و رفاقت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اللہ نے بالآخر انہی جاں نثاروں کو غلبۂ حق کا ذریعہ بنایا۔

لفظ 'حواری' عربی میں اہل کتاب سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے معنی سرگرم و پرجوش حامی و حمایتی کے ہیں۔ قرآن مجید اور انجیل دونوں سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب یہود کے علماء و فقہاء کے رویّے سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے غرباء و عوام اور دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کو دعوت دی کہ اے مچھلیوں کو پکڑنے والو آؤ، میں تمھیں آدمیوں کے پکڑنے والا بناؤں۔ بالآخر انہی کے اندر سے ایک مختصر جماعت

تین سوا تین سو آدمیوں کی، پورے جوش دلی کے ساتھ، دعوت کے کام میں تعاون کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

'مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو خدا کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر اللہ کی طرف چل کھڑا ہوا ہوں۔ تم میں سے جن کے اندر اس راہ میں میری رفاقت کا حوصلہ ہو وہ اٹھے اور میرا ساتھ دے۔ 'حواریین' نے 'نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ' کہہ کر اس دعوت پر لبیک کہی۔

'فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ' قرینہ دلیل ہے کہ یہاں لفظ 'طَآئِفَةٌ' کی تنکیر ایک جگہ تقلیل کے مفہوم میں ہے اور دوسری جگہ تکثیر کے مفہوم میں۔ یعنی بنی اسرائیل میں سے ایک مختصر گروہ (حواریین کا گروہ) تو ایمان لایا اور ایک بڑا گروہ اپنے کفر پر اڑا رہ گیا لیکن خدا کی تائید اہلِ ایمان کو حاصل ہوئی اور وہ بالآخر اہلِ کفر پر غالب ہو گئے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی دعوت کی تکذیب کے بعد سے آج تک یہود کو کبھی اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں وہ رومیوں کے محکوم تھے، پھر قسطنطین کے نصرانیت قبول کر لینے کے بعد سے وہ برابر نصاریٰ کے محکوم رہے اور آج بھی جب کہ بظاہر ان کی ایک آزاد حکومت ہے وہ عیسائیوں ہی کے زیر دست ہیں۔

قرآن مجید میں یہ مضمون دوسرے مقام میں اس طرح بیان ہوا ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ۝

(آل عمران - ۳: ۵۲-۵۳)

پس جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے (علمائے یہود کی طرف سے) کفر کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ اللہ کی طرف بڑھنے میں کون میرے مددگار بنتے ہیں! حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار بنتے ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تو نے اتاری اور ہم نے رسول کی پیروی کی تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ۔

اللہ تعالیٰ کی تائید سے اس سورہ کی تفسیر ان سطور پر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

رحمان آباد

۱۴- مارچ ۱۹۷۸ء

۳- ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ